# خطبہ افتتاحیہ

: پروفیسر مشبر الحق

غنی سچ مچ کے غنی تھے۔ وہ اپنی ذات جئے اور اپنی ذات مرے۔ ان کے خاندانی حالات کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ان کا نسبی تعلق کشمیر کے مشہور اشائی خاندان سے تھا۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے حد یہ ہے کہ ہمیں ان کے والد کا نام نہیں معلوم۔ شادی انہوں نے کی نہیں تھی اس لئے بیوی بچوں کا کوئی سوال نہیں اٹھتا نہ اسلاف کا پتہ، نہ اخلاف موجود ــــ اس کے باوجود غنی زندہ ہیں۔ کیونکہ مولانا آزاد کے بقول

> "انسان کے لئے معیار شرف جوہر ذاتی اور خود کردہ علم و عمل ہے۔ نہ کہ اسلاف کی روایات پارینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہئے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں۔ نہ یہ کہ اپنی عزت کے لئے (ہم) خاندان کے شرف رفتہ کے محتاج ہوں۔ ارباب

ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور اپنی عظمت
اور رفعت کی تعمیر صرف اسی سامان سے کی جو خود ان
کا بنایا ہوا تھا۔" (تذکرہ، ساہتیہ اکادمی، ص ۲۶)

غنی طبعاً تنہائی پسند تھے۔ وہ خلوت میں انجمن سجانے کے شوقین تھے۔ اگرچہ بعض نکتہ دانوں نے ان کے چند متفرق اشعار سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کشمیر سے باہر بھی جاتے آتے رہتے تھے۔ لیکن تذکروں اور تواریخ سے اس کا حتمی ثبوت نہیں ملتا۔ جب تک محققین اس راز سے پردہ نہیں اٹھا دیتے، ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا کشمیر سے باہر جانا خوشبو کے مانند ہے جو گلوں میں محصور رہنے کے باوجود اس کی پابند نہیں رہتی۔ نہ کہیں وہ جاتی ہے، نہ نظر آتی ہے، لیکن اگر ذوق سلیم ہو تو ہم اسے محسوس کر سکتے ہیں

غنی کے کلام کی فنی خوبیوں سے سیمنار کی اگلی نشستوں میں محققین سیر حاصل بحث کریں گے یا ابھی پروفیسر نذیر احمد اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں ان پر روشنی ڈالیں گے۔ میں تو آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ہماری آج کی زندگی میں غنی کی کیا معنویت ہے۔

مادی وسائل و اسباب کے نقطۂ نظر سے ہم غنی کے دور سے بہت آگے جا چکے ہیں۔ آج جو چیزیں حقیقت کا روپ دھار چکی ہیں غنی کے زمانہ میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن کیا اخلاقی حیثیت سے بھی ہم نے کوئی خاص ترقی کی ہے۔ گذشتہ زمانہ کے شعرا کے بارے میں یہ عام شکایت کی جاتی ہے کہ وہ خلعت و انعامات کی خاطر اپنی ذات کو اور اپنے

فن کو سلاطین و امرا کی چوکھٹ پر ہر وقت نثار کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ قاآنی رہے ہوں یا عرفی، غالب رہے ہوں یا ذوق، اس معاملے میں سب برابر تھے۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

لیکن کیا ہم اس معاملے میں ان سے کچھ مختلف ہیں۔ نام بدل گئے ہیں۔ فطرت میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ خلعت کا نام اوارڈ رکھ دینے سے اس کی حقیقت تو نہیں بدل جاتی! لیکن ہم صرف نام کی تبدیلی ہی سے مطمئن ہیں۔

خرد کا نام جنون رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہیئے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

مگر غنی صحیح معنوں میں صلہ و ستائش کی تمنا سے مستغنی تھے۔ ان کے ہم عصر ہندوستانی و ایرانی شعراء مغل دربار کی داد و دہش سے مستفید ہو رہے تھے۔ خود سلاطین کشمیر کے یہاں عنایات کا چشمہ رواں رہتا تھا۔ لیکن غنی آب حیوان تک دسترس کے باوجود تشنگی کو حاصل زندگی سمجھتے رہے۔ ان کی نظروں میں سب سے زیادہ قیمتی شے فرد کی اپنی ذات تھی۔ کہتے ہیں کہ جتنی دیر وہ اپنے گھر میں رہتے۔ گھر کے سب دروازے اور کھڑکیاں بند رکھتے جب باہر جاتے تو دروازے اور کھڑکیاں چوپٹ کھول جاتے لوگوں

نے جب اس کا سبب پوچھا تو بولے کہ میرے گھر میں خود مجھ سے زیادہ قیمتی شے اور کیا ہو سکتی ہے۔ جب میں ہی گھر میں نہیں ہوں تو پھر کوئی کس چیز کو لے جائے گا۔

درین خانہ جز من متاع کجاست

بظاہر یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے لیکن غور کیجئے تو غنی کا یہ طرز عمل ہماری اپنی سماجی قدروں پر ایک مکمل طنز ہے۔ قفل بندی معاشرہ کی دیانت پر عدم اعتماد کے مترادف ہے۔ غالب تو دن میں لٹ جانے کے بعد رات کو بے خبر سوتے تھے۔ لیکن غنی لٹنے سے پہلے لوٹنے والوں کو صدائے عام دیتے تھے اور اس طرح بتانا چاہتے تھے کہ بھروسہ بھروسے کو جنم دیتا ہے۔ ہم دوسروں کے جواب کی فکر کئے بغیر ان پر اعتماد کریں تو ایک نئی دنیا وجود میں آسکتی ہے ایک ہندی گیت کا مکھڑا ہے

"ہردے کے پٹ کھول سکھی ری

ہردے کے پٹ کھول ـــــــ

کہ سیّاں کھڑے ترے دوار"

لیکن یقین کیجئے کہ سیّاں دوارے ہی کھڑے انتظار کرتے رہ جائینگے اور ہردے کے پٹ کھل نہ سکیں گے اگر گھروں کے دروازوں پر تالے پڑے رہینگے۔

غنی ایک صوفی شاعر تھے۔ لیکن ایسے بھی صوفی نہیں تھے جو غم و آلام سے گھبرا کر اپنی ذات میں گم ہو جانے کی کوشش کرتے

وہ عزلت گزینی کے باوجود آنکھیں کھلی رکھتے تھے۔ اور ایک ایسے انقلاب کی آرزو رکھتے تھے جو ایسے لوگوں کو جنم دے سکے جو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے، محنت کرنے، اور غربت میں بھی سینہ تانے رکھنے کو حاصل حیات سمجھتے ہیں۔

غنی در ملک دنیا انقلابے آرزو دارم
کہ خاک از گردش گردوں غبار آسیا گردد

لیکن سماجی انقلاب سینے پر زخم کھانے سے آتی ہے اپنے کو ڈھال کی اوٹ میں چھپانے سے نہیں۔

در معرکہ، صد زخم رسد گر بہ تن ما
زاں بہ کہ بود داغ سپر بر بدن ما

دوسروں کی خاطر اپنے کو مٹا دینا غنیؔ کی نظروں میں حاصل حیات تھا کیونکہ نافہ میں بند خوشبو اسی وقت پھیلتی ہے جب آہو اپنے کو قربان کر دیتا ہے ؎

نہ گردد شعر من مشہور تا جاں در تنم باشد
کہ بعد مرگ آہو نافہ بیروں میدہد بورا

کشمیر میں فارسی کا دور دورہ تقریباً پانچ سو سال تک رہا ہے اس طویل مدت میں فارسی زبان وادب نے کشمیر کی علمی ادبی اور تہذیبی تاریخ کو اس طرح متاثر کیا کہ لوگ کشمیر صغیر کہنے لگے آج بھی کشمیری طرز معاشرت میں ایرانی تہذیب کے

اثرات محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

ایران کبیر اور ایران صغیر میں صدیوں تک فارسی ایک رشتۂ اتصال کا کام دیتی رہی ہے۔ تاہم فارسی زبان وادب کے میدان میں کشمیر اپنی ایک جداگانہ حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یہاں کے فارسی ادیبوں اور شعراء کو تین قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو باہر سے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ دوسرے وہ جو یہاں طویل عرصہ تک رہ کر واپس چلے گئے اور تیسرے وہ جنہوں نے یہیں کی مٹی سے جنم لیا اور یہیں کی زمین میں دفن ہوگئے۔ غنی کا تعلق اسی تیسری قسم سے ہے۔ خیال رہے کہ نہ تو باہر سے آنے والے خالی ہاتھ آئے ہیں اور نہ باہر جانے والے تہی دست ہوتے ہیں۔ دونوں ہی کے درمیان غیر محسوس طریقے پر لین دین کا عمل جاری رہتا ہے۔ اور باہمی تبادلہ کا عمل سے زبانوں اور تہذیبوں کی ترقی کا راز ہے۔

کشمیر یونیورسٹی کا شعبۂ فارسی قابل مبارکباد ہے کہ وہ کشمیر کی ایک اہم ادبی شخصیت کو محور بنا کر یہاں کی ادبی اور تہذیبی تاریخ کے چھپے ہوئے گوشوں کو سامنے لانے کی کوشش کر رہا ہے۔

آج کی دنیا اگرچہ حال اور مستقبل کی دنیا ہے۔ لیکن نہ حال ٹھیک ہو سکتا ہے اور نہ مستقبل، اگر ہم اپنے ماضی

کی طرف سے آنکھیں بند کریں۔ آگے بڑھنے کے لئے قصہ پارینہ کی گاہے گاہے باز خوانی بہت ضروری ہوتی ہے اور یہ سمینار ایک طرح سے اس اصول کی پیروی کے مترادف ہے۔

اپنی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ میں اس سمینار کا افتتاح کرتا ہوں اور آپ تمام حضرات کا اپنی طرف سے اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہمارے دعوت نامے کو قبول کیا اور یہاں تشریف لائے۔

Scanned with CamScanner